درد کی چھاؤں میرا گاؤں

اُردو مجموعہ شاعری از ڈاکٹر اسلم رانا

پروفیسر ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد
ڈین/پرنسپل اورینٹل کالج (نگران مقالہ پی ایچ ڈی)
ثوبیہ اسلم
پی ایچ ڈی (سکالر) شعبہ پنجابی، اورینٹل کالج، لاہور

ASLAM RANA'S URDU ANTHOLOGY

AN INTRODUCTORY STUDY

Ismatullah Zahid, PhD
Dean/Principal Oriental College, Lahore
Sobia Aslam PhD (Scholar)
Department of Punjabi, Oriental College, Lahore

Abstract

Dr. Muhammad Aslam Rana was a teacher of Punjabi language. He served as the chairman of the Department of Punjabi, University Oriental College, Lahore. He was a great scholar and well read personality. Though he was mainly known for his research work and editing of both Punjabi and Urdu books, he also contributed to different Urdu and Punjabi papers. His contributions are highly esteemed. Besides he also had literary flare and composed verse in Punjabi and Urdu. His Urdu anthology namely DARD KI CCHAOWN MAYRA GAOWN was warmly welcomed by the literary circles of Pakistan. This article is an effort to present an introductory study of the said anthology.

Keywords: Aslam, Rana, Dard ki Chawon Mera Gawon, Nawen Nazam

تنقید ایک تخلیقی عمل ہے۔اس میں ایک فن پارے کی طرح حسن، شگفتگی اور ادبی چاشنی کا ہونا لازمی اَمر ہے۔اگر شاعری دکھوں کی تجارت ہے تو پھر تنقید بھی ان دکھوں کے نفع اور نقصان میں برابر کی شریک ہے۔ایک نقاد اسی تخلیقی عمل سے گزرتا ہے جس سے ایک تخلیق کار کو گزرنا پڑتا ہے۔شاعری، ناول یا افسانے کی طرح تنقید بھی عام فہم، عمومی سمجھ بوجھ کے مطابق ہوتی ہے۔نقاد کا کام تخلیق کو سمجھنا اور پھر اپنے قاری کو سمجھانا ہے۔ٹی ایس ایلیٹ کے مطابق تنقید ایک انسان کے لیے سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے۔اگر غور کیا جائے تو ایلیٹ کا یہ قول عالمی سچائی کا حامل ہے۔ادب کی اصناف کا مطالعہ ہو یا پھر شخصیتوں کا، رجحانات کی بات ہو یا میلانات کی، تذکرہ ادبی تحریک کا ہو یا کسی دبستان کا قصہ مختصر کسی بھی طرح کا تنقیدی مطالعہ کیوں نہ ہو تنقید ہمیشہ ایک رہنما ستارے کی طرح کام کرتی ہے۔یہی تنقید کا وہ اعلیٰ منصب ہے جہاں پر تنقید نظریے کی بنیاد کی صورت میں فلسفے کی ہم پلہ ہو جاتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ کچھ بڑے اہم اور اعلیٰ شاعر بہت اچھے تنقید نگار بھی تھے۔ارسطو نے شعر اور تنقید کی پہلی باضابطہ کتاب 'بوطیکا' لکھی۔افلاطون نے ارسطو کی طرح باضابطہ خود تو کوئی تنقید کی کتاب نہیں لکھی لیکن اس نے Phaedrus' Republic اور Ion وغیرہ میں ڈرامے اور شاعری کے تخلیقی عمل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا آج ان کی افادی یا غیر افادی صورت کے قطع نظر یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ یہ ایک فلسفی کے خیالات تھے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تنقید اپنی بہترین صورت میں نظریے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نظریہ فلسفہ کی ہی ایک شکل ہے۔(۱)

○

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، شعبہ پنجابی کے ہر دلعزیز استاد، شاعر، نقاد، محقق، نثر نگار، مرتب، تدوین کار، شارح ڈاکٹر اسلم رانا قطبی والہ تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں ۱۸/اگست ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد رانا خیرات اللہ تقسیم کے وقت محکمہ مال میں پٹواری تھے۔پاکستان بننے کے بعد یہ خاندان ہجرت کر کے چک نمبر 365/EB، وہاڑی تحصیل بوریوالہ میں آ کر آباد ہوا اور ادھر ہی انھیں کچھ زمین الاٹ ہوئی۔ڈاکٹر اسلم رانا نے ۱۹۶۱ء میں فاضل پنجابی کا امتحان پاس کیا، پھر ۱۹۷۵ء میں ایم اے پنجابی اور ۱۹۷۸ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔۷۱-۱۹۷۰ء میں ان کے کالم

'لاہوریات' کے عنوان سے 'نصرت' اور 'مساوات' میں چھپتے رہے۔ تیرہ سال تک ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن پر کئی ادبی پروگرام کرتے رہے۔ ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنی مختصر سی زندگی میں بلغاریہ، جرمنی، ترکی اور ایران کے دورے کئے اور زندگی میں بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ اپنے استاد شریف کنجاہی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت دکھ اٹھائے۔ بچپن ہی سے کرب کے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔ اور پھر زندگی اور معاشرے نے فٹ بال کی طرح اپنے پاؤں کے آگے رکھ لیا اور آج تک اس کی ٹانگیں اور ٹانکے اکھڑ گئے ہیں۔ ابھی تک زمانے کی ٹھوکروں کی زد میں ہوں۔

ڈاکٹر اسلم رانا اپنی زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ کر ۲۱ جون ۱۹۹۶ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ اردو ادب کے علاوہ پنجابی ادب میں اکتیس کتابیں یادگار چھوڑیں جن میں پنجابی شاعری کے دو مجموعے ''تپدی تریل'' اور ''ساون سفنے'' اور اردو شاعری کا ایک مجموعہ ''درد کی چھاؤں میرا گاؤں'' بھی شامل ہے، جب کہ تنقید کی متعدد کتابیں لکھیں مثلاً رنگ سنگ، یار فرید، ادب کہانی، نوک پلک، رمز روایت، پرکھ پریت، سخن خزینے، سرمد سوچاں، سانجھ سویر، حرف حقیقت اور سچل سرمست وغیرہ۔ آپ نے چند ایک پنجابی کتابوں کی ترتیب وتدوین کی جن میں چونواں پنجابی ادب (بہ اشتراک)، تنقیدی وچار (بہ اشتراک)، ادبی مہکاں (بہ اشتراک)، پھل پھلواڑی (بہ اشتراک)، سسی، ادبیات باہوؒ، مرزا صاحباں، انتخاب کافیاں خواجہ غلام فرید، اوڑک ہوندی اُو، اکھیاں دے پرچھاویں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اردو کتابوں کا ترتیبی وتدوینی کام سرانجام مثلاً آداب الطالبین مع رفیق الطلاب والباب ثلاثہ (شیخ محمد چشتی گجراتی) مترجم ڈاکٹر بشیر حسین مرحوم، سوانح حیات حضرت مہر محمد صوبہ، دریاب از ریاض احمد، تنقیدی مسائل از ریاض احمد، تصدیق از ریاض احمد، دہان زخم از ریاض احمد۔ اس کے علاوہ کئی ایک کتب پر نظر ثانی کی اور متعدد سیمی ناروں، کانفرنسوں اور مجالس وغیرہ میں شرکت کی۔ (۲)

ڈاکٹر اسلم رانا نے اپنی ملازمت کا آغاز بورڈ آف ریونیو سے کیا جہاں پر ان کی ملاقات پنجابی کے دو مشہور شاعروں اختر کاشمیری اور منظور وزیر آبادی سے ہوئی۔ اس وقت اسلم رانا پنجابی اور اردو میں کہانیاں لکھتے تھے۔ اس طرح ان کا رجحان اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی کی طرف زیادہ ہوتا گیا۔ آخر کار انھوں نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم۔ اے پنجابی کیا اور وہیں بطور لیکچرار ملازمت

اختیار کر لی۔ بعد میں پی ایچ ڈی کی اور شعبہ پنجابی کے مسند نشین بنے۔ تنویر ظہور لکھتے ہیں:

''اورینٹل کالج توں وکھ کرشن نگر اوہناں دے گھر وی کئی ملاقاتاں کیتیاں۔ ''سانجھاں'' جاری کیتا تاں اوہ ''اُچے برج لہور دے'' ناں تے مستقل کالم لکھدے رہے۔ جس وچ لہور وچ ہوئیاں پنجابی تقریباں دی کوریج ہوندی سی۔ اوسدی ساویں رپورٹنگ نیں سی کردے سگوں اوہناں دے کالماں وچ تخلیقی پن جھلکدا سی۔ ''سانجھاں'' وچ اوہناں دیاں کہانیاں، شاعری تے دوجیاں شخصیتاں دے کیتے انٹرویوز تے ترجمے وی چھپدے رہے۔''(۳)

اردو میں ڈاکٹر اسلم رانا کی شاعری کی ایک کتاب لاہور سے ۱۹۹۲ء میں بعنوان ''درد کی چھاؤں میرا گاؤں'' شایع ہوئی۔ کتاب کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش، شریف کنجاہی اور ڈاکٹر نبیل احمد خاں نے اپنے اپنے رنگ میں تاثرات کا اظہار کیا۔

''درد کی چھاؤں میرا گاؤں'' میں کل اسّی نظمیں شامل ہیں جنھیں تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ذوالفقار احمد تابش ڈاکٹر اسلم رانا کی شاعری بارے لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ بڑی شاعری میں جذبے، احساس، مضمون، موضوع وغیرہ الگ الگ خانوں میں نہیں ہوتے۔ سارے جذبے، سارے احساس، سارے عمل اور ردعمل جب باہم آمیختہ ہوکر، یکجا ہوکر ایک تخلیق کے عمل سے گزرتے ہیں تو اس سے بڑی شاعری وجود میں آتی ہے۔ وہ شاعری جو زندہ رہتی ہے۔ صدیوں کی دھوپ چھاؤں برداشت کرسکتی ہے۔ اسلم رانا تخلیق کے جس دشت کے سفر کو نکلے ہیں اس کی کوئی انتہا نہیں۔''(۴)

مزید لکھتے ہیں کہ اسلم رانا جدید تر شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اظہار کے کسی ایک ذریعے اور سانچے تک محدود نہیں رکھا۔ کھلی ہوا اور فضا میں پروردہ اسلم رانا کا ذہن اور قلب بھی کشادہ اور فراخ ہے۔ اس نے کسی زبان، کسی اسلوب اور کسی پیرائے کو اپنے حواس پر طاری کرنے کی بجائے انھیں اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ تنقید لکھتے ہیں، کہانیاں لکھتے ہیں اور پنجابی

اُردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس کہنے کے لیے اتنا کچھ ہے کہ فراخدلی سے خرچ کرنے کے باوجود اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی بل کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے اسلم رانا کی صلاحیتیں زیادہ نکھر کر سامنے آرہی ہیں۔ ''درد کی چھاؤں میرا گاؤں'' ایک ایسے شخص کے احساسات کا اظہار ہے جو ایک طرف تو اپنی دھرتی سے دوری کے ابتلا میں گرفتار ہے تو دوسری طرف اسی داغِ جدائی نے اس کے قلب و جان کو درد آشنا کر رکھا ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں انھی دو تجربوں کے زیر اثر لکھی گئی ہیں اور انھی دو المیوں کی نوحہ گری کا مؤثر اظہار ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں حمدیہ اور نعتیہ ہیں اور کچھ نظمیں اپنے عہد کے حوالے سے اردگرد کے مناظر، تاثرات، احساسات، تجربات اور ردعمل کا نتیجہ ہیں۔

دھرتی سے جدائی اور ہجر کا تجربہ اسلم رانا کی شاعری کے دو بنیادی اور اہم عناصر ہیں؛ پہلا دھرتی سے جدائی کا، دوسرا ایک شخص، ایک چہرے سے جدائی کا۔ اس لحاظ سے یہ شاعری بنیادی طور پر ہجر کی شاعری ہے۔ محبت انسانی زندگی کا ارفع جذبہ ہے تاہم یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان ہجر آشنا نہ ہو۔ فراق ہی محبت کو ابدیت عطا کرتا ہے ورنہ محبت کی زندگی زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ (۵)

شریف کنجاہی کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر اسلم رانا کی کسی کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کا خیال تو اک عرصہ سے تھا لیکن بوجوہ آج سے پہلے ممکن نہ ہوا۔ اور اب جیسے موصوف نے میری خود کلامی سنتے ہوئے مجھے اپنے اردو کے شعری مجموعہ کے لیے فرمائش کر دی ہے جو ایک لحاظ سے میری اپنی ہی تمنا کی صدائے بازگشت ہے۔ ان الفاظ کے لکھنے اور لکھوانے کے پیچھے وہی جذبہ کارفرما ہے۔ میری یہ سطریں ہی اصل میں اسی نوعیت کی ہیں اور اسی لیے ان میں نے ڈاکٹر اسلم رانا کی شاعری کی بات نہیں کی۔ نبیذ قرب باہم پینے کی راہ نکالی ہے اور ان لفظوں کو بھال جانے کے زہر کے تریاق کے طور پر استعمال کیا ہے کہ اسلم رانا جب کبھی پڑھے گا یہ لمحے اور ان لمحوں سے پہلے کے تمام لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر مجھے ہی اس کے سامنے لے آیا کریں گے۔ یعنی یہ فلیپ قارئین کے لیے نہیں اسلم رانا کے لیے ہے۔ (۶)

اسی طرح ڈاکٹر نبیل احمد خاں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد اسلم رانا پنجابی زبان و ادب کے معروف استاد، ناقد اور شاعر ہیں۔ ادبیات کے بیشتر اساتذہ اپنے شعبے کے دائرے ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ مگر رانا صاحب کا تجسس انھیں بار بار جدید اردو اور مغربی ادب سے رابطہ قائم کرنے پر مائل کرتا ہے۔

تخلیقی سطح پر بھی وہ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری پر قادر ہیں۔محمد اسلم رانا کا اردو مجموعہ کلام ''درد کی چھاؤں میرا گاؤں'' جدید اردو نظم کے مرکزی طرز احساس اور نظم نگاری کے اہم نمائندوں کے اسالیب سے ان کی شناسائی کا مظہر ہے۔اس مجموعہ کی نظموں میں ایک حساس اور باخبر شخصیت سے ہمارا تعارف ہوتا ہے جسے زندگی کی معصومیت اور حیرانی کے کھو جانے کا رنج ہے۔جو گاؤں (جو فطرت کا نمائندہ ہے) اور شہر (جو تصنع کا مظہر ہے) کے تضاد سے مضطرب ہے۔جو اداس پرندوں کے نوحے سنتا ہے اور جسے بدلتے ہوئے حالات میں اپنی شناخت اور اپنے اعتبار کو قائم رکھنا مشکل مرحلہ محسوس ہو رہا ہے۔مگر دوسری طرف وہ گرد و پیش کے حقائق سے ذہنی رشتہ قائم کرنے کی سعی میں مصروف ہے اور سماجی سطح کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج بھی کر رہا ہے۔جیسے ڈاکٹر اسلم رانا اپنے گاؤں کی تعریف اس طرح سے کرتے ہیں:

ریت کے ٹیلوں کے بیچ/ندی کنارے
چھوٹا سا اک گاؤں/وہیں پہ مجھ کو ڈھونڈ رہی ہے
درد کی ٹھنڈی چھاؤں/جس کے دامن میں
کبھی جلے نہ/میرے ننگے پاؤں (درد کی چھاؤں میرا گاؤں)

محمد اسلم رانا کے ہاں خطابیہ، بیانیہ، تمثالی انداز مختلف سطحوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ایک طرف گاؤں کا منظر نامہ جہاں راجباہ، شیشم اور سرس کے درخت اور کھیت ہیں دوسری طرف داستانی اور حکایاتی انداز اور خوابوں کی سی فضائیں۔اسلم رانا صاحب نے راشد، فیض، مجید امجد، ضیاء جالندھری اور منیر نیازی جیسے اہم شعرا کے شعری اسالیب سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی ہے۔اور وہ اپنی انفرادی آواز پیدا کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔(۷)

غرض کہ اسلم رانا ایک محبت بھرا دل رکھنے والا حساس فنکار ہے۔ایسے فنکار جب دیہات سے بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو کھیتوں، کھلیانوں، درختوں، پگڈنڈیوں، میدانوں، بیلوں، دوپہروں، شاموں، گیتوں، قہقہوں اور معصوم دوستیوں کی یادیں عمر بھر ان کا پیچھا کرتی ہیں۔شہروں کی چکاچوند انھیں مسحور تو ضرور کر لیتی ہے لیکن ان کے خوابوں پر قابض نہیں ہو پاتی۔

ایسے فنکار اپنی دھرتی کے اسیر رہتے ہیں۔ اسلم رانا کی تخلیقات میں دھرتی کے سارے مظاہر اپنی ساری خوب صورتی، تاب ناکی اور دل کشی کے ساتھ ہمیں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ جو گہری دوستی اور رفاقت انھیں حاصل رہی ہے وہ اب بھی ان کی یادوں کا حصہ ہے۔ خوش کرنے اور دکھ دینے والے خوابوں کا منظر نامہ ہے۔ یہ نشانیاں ان کی عزیز ترین متاع ہیں۔ پرانے خواب، گزرے ہوئے مناظر اور بیتے ہوئے لمحے یہ جب تخلیق میں ڈھلتے ہیں تو زندہ ہو جاتے ہیں۔ سانس لینے لگتے ہیں، دامن دل کو چھو جاتے ہیں تو درد آشنا بھی کر جاتے ہیں۔ اسلم رانا کی نظموں میں یہ سارے مناظر جیتے جاگتے نظر آتے ہیں لیکن خواب و خیال کی دنیا میں یادیں اور جذبے بڑی شعبدے بازی بھی کر جاتے ہیں اور انسان اپنے ہی وطن میں پردیسی بن جاتا ہے۔ اپنے گاؤں میں مسافر ہو جاتا ہے۔ شاید کسی احساس جرم کے زیر اثر ایسے میں یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ روٹھ گیا ہے۔ سب اجنبی ہو گئے ہیں۔ پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ الم ناک لمحہ یوں تو جان لیوا ہوتا ہے مگر شاعر حضرات اس سے بچ نکل آتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک بڑی تعداد اُن نظموں کی ہے جنھیں ہجر کی ساعتوں نے تخلیقی عمل سے گزارا ہے۔ ایک چہرہ بار بار ان نظموں کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے۔ بچھڑنے والے کا چہرہ، اس کے خد و خال، اس کی باتیں، اس کی محبت، اس کے اطوار بار بار طلوع ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا بھی ان نظموں کی سادگی اور جذبے کی سچائی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ نظمیں بتاتی ہیں کہ شاعر جذباتی طور پر کتنی شدت کے ساتھ اس شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی ایک ساعت اس کے لیے کتنی وقعت رکھتی ہے۔ وہ ان لمحوں کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔ اسی لیے انھیں بار بار سمیٹتا اور سنبھالتا ہے کہ کوئی ایک لمحہ بھی پھسل کر اس کے ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔ شاعر کی اس معصومیت اور والہانہ پن سے پتا چلتا ہے کہ یہ یادیں اب اس کی متاعِ حیات ہیں..... ان یادوں کا احیا اس کی حیات کا حاصل ہے۔ ہجر کی نظموں میں رونا دھونا اور واویلا نہیں ہے بل کہ یہ نظمیں بازگشت ہیں گزرے لمحوں اور بیتی یادوں کی۔ شاعر نے اپنے محبوب کے ساتھ گزرے ہر لمحے کو سچائی کے ساتھ یاد کر کے اور اس کی ساری تفصیل کو گہری وابستگی کے ساتھ سوچ کر اسے پھر پانے کی آرزو کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

پھر ذہن کے پردے پر/ بے چین خرابوں میں

اور دل میں چھپے بیٹھے/ بے آب سرابوں میں
اک چاپ سی گونجی ہے/ اک ٹیس سی اُبھری ہے
پھر روح کے خلیوں میں/ پھر تن کے مساموں میں
یادوں کے جزیرے سے آباد ہوئے جیسے/ بے چین خرابے سے
شاداب ہوئے جیسے/ آواز کا اک جادو
پھر من میں جاگا ہے/ پھر سوئے ختن دل کا
آہو سا بھاگا ہے(۸)

.....

یادوں کی اُجڑی بستی میں/ یہ مسافر کہاں سے آیا ہے
اپنے ماضی کو ڈھونڈتا ہے شاید/ اے مسافر!
تیرا ماضی تو کب کا جا چکا ہے/ بیتے برسوں کے ملبے کے نیچے دب کر
کب کا موت سے ہم آغوش ہو گیا ہے/ دیکھو! شکستہ دیواروں
اور اُجڑے آنگن/ اور ان بے چھت جھونپڑیوں میں اب کیا رکھا ہے(۹)

اسلم رانا کی بیشتر نظموں میں محبت اور محبوب کا تصور یا تو شخصیت (ذات نہیں) سے منسوب ہے یا کردار سے۔ شخصیت اور کردار میں فرق ہے کہ اوّل الذکر میں محبوب کی انفرادیت پر توجہ زیادہ رہتی ہے جب کہ کردار محبوب کی نمائندہ حیثیت کو اُبھارتا ہے۔ مثلاً غزل (خصوصاً روایتی غزل) میں محبوب کی شخصیت کی بجائے اس کے کردار کو سامنے رکھ کر شعر کہے جاتے تھے۔ اس لیے تمام شعرا کے محبوب ایک ہی سی صفات کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ اسلم رانا کے ہاں شخصیت کی تعبیر کی بڑی واضح مثال اس مجموعے کی بیشتر نظموں میں جھلکتی ہے۔ ایک خاص تاریخ کے تعین سے اس شخصیت کا تعین بھی مشکل نہیں رہتا۔ ان کی نظموں میں ایک شبیہ بار بار اُبھرتی ہے اور اس کے نقش روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس شخصیت کے لیے 'پنل'، 'سانول'، 'محرم' اور 'محمل' وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس طرح خواجہ غلام فریدؒ کے ہاں اس طرح کے الفاظ 'فخر جہان'، اُن کے

مرشد اور بڑے بھائی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ اس شخصیت کے بچھڑ جانے سے پیدا ہونے والا دورِ مہجوری، ازلی ہجر اور ابدی فراق کا وہ معنوی درد ہے جو پاکیزگی کا مظہر ہوتا ہے۔ وہاں تو بس خیال، خواب، ہستی، بستی، روح، جسم، دل اور ذہن ہر آن ایسی سوچوں اور تصورات کے بھنور میں گھرے ہوئے موجود اور نا موجود کے ہر لمحے کو جاوداں بنانے کے عمل کی تکمیل مقصود ہوتی ہے:

پھر تیرے شیریں لبوں سے/نغمۂ فردوس پھوٹا .....اور
میری ہستی کی خشک کھیتی کو جیسے کہ سیراب کر گیا تھا/میرے بنجر سے جذبوں میں جیسے
جام پر جام بھر گیا تھا/میری آنکھوں سے تیری جلوؤں کی
جیسے برسات ہو رہی تھی/رات کے ماحول میں ایک اور رات ہو رہی تھی
جیسے میرے اور تیرے بیچ حائل/بکھری ابدوں کی دوریاں سمٹ کر
ایک نقطے میں تحلیل ہو رہی تھیں/گویا وصل کے موتیوں کو پرو رہی تھیں
پھر کہیں دور سے گجر کی صدائیں آئیں/جس سے لمحۂ وصل بے کیف ہو گیا تھا
جس سے شیرازۂ محبت بکھر گیا تھا/واپسی کی اذان گونجی
طلوعِ صبحِ جفا ہوئی تھی/پھر بھی دیکھو!
یہ خواب اور خیال سارے/تصور اور حسرتوں کے منظر
یہی ہیں اب تو ملن کے رستے/سدا تم ان کو سجاتے رہنا
خوابوں میں میرے آتے رہنا(۱۰)

یادیں انسان کی زندگی کا بہت ہی قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں کہ ان کے سہارے گزرے لمحوں کو واپس لایا جا سکتا ہے۔ وہ محبتیں جو روٹھ گئی ہوں انھیں پھر سے منایا جا سکتا ہے۔ یادوں کی بازگشت زندگی کو آسان کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ چہرے جو بچھڑ گئے ہیں انھیں پھر سے دل کے آفاق پر روشن کیا جا سکتا ہے۔ یادوں میں ہم ایک طرح سے Relive کر سکتے ہیں۔ یادیں اس اعتبار سے ایک عجیب جادونگری ہیں۔ یہاں سب کچھ پھر اسی طرح زندہ، اصل اور سانس لیتا ہوا بن جاتا ہے جس طرح

کہ بہت پہلے تھا۔ یوں انسان کو زندہ رہنے کے لیے ایک سہارا مل جاتا ہے۔ یادیں تکلیف دہ بھی ہوتی ہیں لیکن ان کا یہ مثبت پہلو انسانی زندگی کے لیے کتنا قیمتی ہے۔ اسلم رانا کی کئی نظموں میں انھوں نے اپنے گزرے لمحات کو جس طرح Relive کیا ہے اور جس طرح انھوں نے ان یادوں کو تازہ کیا ہے اور ان کے دکھ سکھ کو محسوس کیا ہے، ایک عجیب تجربہ ہے:

میں اسیر ہوں/ اس چمکتے لمحے کا
جس کی اسیری نے کئی بار/ تیرے ہجر کے بھیگے لمحوں سے
مری آنکھوں کو جل تھل وضو کرائے تھے/ پھر جلدی ہی چاند ستارے
ان سے ملنے آئے تھے(۱۱)

.....

آ کے دیکھ تو سہی/ چمن میں ہر سُو
بے رنگ اجنبی موسموں نے/ اداسیوں کی چادر اتار دی ہے
وصل کی امید افزا فصل/ جڑ سے اکھاڑ دی ہے(۱۲)

ذوالفقار احمد تابش کے مطابق اسلم رانا تخلیق کے جس دشت کے سفر کو نکلے ہیں اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ان کا جذبہ سچا اور صادق ہے۔ ان کے پاس یادوں کی ایک گٹھری ہے جس میں چھوٹی بڑی بہت سی رنگ برنگی چیزیں ہیں۔ ان کو دیس پردیس، محبت اور فراق کے تجربے بھی میسر آئے ہیں۔ ان کے پاس ایک حساس دل ہے۔ انھیں یادوں کو یاد کرنے، انھیں سنبھالنے اور سمیٹنے کا طریقہ بھی آتا ہے۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ ان یادوں اور ان جذبوں کے ست رنگے دھاگوں سے وہ کیسی کیسی قوس قزح تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس لیے یقیناً امید کی جا سکتی ہے کہ جوں جوں وقت آگے بڑھے گا ان کی آواز زیادہ دل کش ہوگی۔ لب ولہجہ اور نکھرے گا۔ اظہار کے فن پر ان کی گرفت اور توانا ہوگی۔ انھیں اچھی شاعری کے جوہر تو ملے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کا ہنر اور بھی جگمگائے گا۔

اس مجموعے میں کچھ نظمیں ایسی ہیں جو ایک اعتبار سے فنطیسی کے قریب ہیں، یہ نظمیں خاص طور پر دل چسپی کی حامل ہیں۔ ان میں اَن دیکھی جہتوں میں جھانکنے، دن میں خواب دیکھنے، خیال

آرائی کرنے اور جانے پہچانے رنگوں سے نئے رنگ تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے۔مثلاً:

آج کی رات ہے بھاری رات/تم باہر نہ آنا لوگو
میں نے سنا ہے چاند گرہن ہوگا/ اور
اس سمے جو آنکھوں والا/ چاند کی جانب دیکھے گا
وہ اندھا ہو جائے گا(۱۳)

.....

خوشی کے لمحے/ اداس گھڑیوں کی سولیوں پر سوار ہو کر
مرادمنزل کے پاس آ کر/مرادمنزل سے دو قدم پر رکے ہوئے ہیں
اداس اور زرد روسے پنچھی/ چنار کی ننگی ٹہنیوں پر خموش بیٹھے
اداس نظروں سے تک رہے ہیں(۱۴)

.....

پیاس کی شدت سے زباں باہر لٹک رہی ہے/ سانس کی مدھم لے بھی اب تو کھٹک رہی ہے
ایمان و ایقان گم ہوئے ہیں/ ہم اپنی پہچان کھو چکے ہیں
ہم میں ہر کوئی یہ سوچتا ہے/ کہ پہلے کون گرے گا(۱۵)

.....

ہمارے نیچے/ ہر اس آمیز دلدلوں کے عجیب تر سلسلے ہیں
جن سے/ ہزاروں حشرات سر نکالے
ہمارے پاؤں کے ننگے تلوؤں کو چاٹتے ہیں/ اور اپنے دانتوں سے
پنڈلیوں کی نزار جلدوں کو کاٹتے ہیں/غریب و بے بس ہیں ہم
کہ چاروں طرف سے آتی سبھی بلاؤں کے ظلم پیہم اٹھا رہے ہیں
مگر سمجھنے یا سوچنے کی یا کچھ کر گزرنے کی
ہر صلاحیت سے عاری سے ہو گئے ہیں(۱۶)

اس فنطیسی کو بعض نظموں میں اسلم رانا نے فرد کی حد سے آگے نکل کر پورے معاشرے یا پوری نوع انسانی یا تاریخ پر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر 'سوال'، 'برسوں پہ پھیلی رات'،

'عہدنامہ جدید'، 'تیسری دنیا کا نوحہ'، 'اداس پرندوں کا نغمہ'، 'بے پھل فصلیں'، 'جلتے سورج کے نیچے'، 'اپنی دھرتی کے نام' اور 'بنجر دعاؤں کا آسیب' وغیرہ۔ ان نظموں کا اپنا ایک پورا سلسلہ ہے جو صرف اپنے وسیع تر کینوس کی وجہ سے ہی نہیں بل کہ اپنی مخصوص نفسیات کی وجہ سے بھی دوسری نظموں سے الگ ہے اور پھر ان کی بعض نظموں میں ماضی قریب کا پرتو بھی جھلکتا ہے لیکن اس طرح کہ جیسے بعض نظموں مثلاً 'فرار'، 'کون بڑا ہے'، 'یہ کیا ہوا ہے شہر کو' اور 'برسوں پر پھیلی رات' وغیرہ میں کہیں کہیں طنز کا وار بڑا بھرپور اور گہرا ہے۔ اصل میں اسلم رانا نے اَن گنت خواب دیکھے ہیں اور خواب دیکھ کر وہی خواب کسی دوسرے کو دکھلانا آسان کام نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) ڈاکٹر سلیم اختر، دیباچہ، تنقیدی اُصول تے نظریے، ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی، پنجابی زبان و چ نظریاتی تنقید، لاہور: مکتبہ کاروان، ۱۹۹۲، ص ۳

(۲) ڈاکٹر عاصمہ قادری، ڈاکٹر اسلم رانا کی شاعری مقالہ ایم اے پنجابی، لاہور: اورینٹل کالج جامعہ پنجاب، ص

(۳) وڈے لوک وڈیاں گلاں، تنویر ظہور، لاہور: مسعود کھدر پوش ٹرسٹ، جون ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۲

(۴) درد کی چھاؤں میرا گاؤں، فلیپ کور، ذوالفقار احمد تابش، اکتوبر ۱۹۹۱ء

(۵) اسلم رانا، درد کی چھاؤں میرا گاؤں، دیباچہ از ذوالفقار احمد تابش، لاہور: پولیمر پبلشر اردو بازار، ۱۹۹۲ء، صفحہ ۱۳۔۱۴

(۶) درد کی چھاؤں میرا گاؤں، فلیپ، شریف کنجاہی ۱۹۹۲۔۷۰

(۷) درد کی چھاؤں میرا گاؤں، فلیپ، ڈاکٹر سہیل احمد خان پروفیسر اردو، لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی

(۸) ڈاکٹر اسلم رانا، درد کی چھاؤں میرا گاؤں، ''بازگشت''، لاہور: پولیمر پبلی کیشن اردو بازار، ۱۹۹۲ء، ص ۴۰

(۹) ایضاً، ''گئے دلوں کی جستجو''، ص ۱۰۴

(۱۰) ایضاً، ''وصل گزیدہ''، ص ۹۸

(۱۱) ایضاً، ''لمس کا جادو''، ص ۶۰

(۱۲) ایضاً، ''آ کے دیکھ تو سہی''، ص ۹۴

(۱۳) ایضاً، ''برسوں پر پھیلی رات''، ص ۱۲۴

(۱۴) ایضاً، ''اداس پرندوں کا نغمہ''، ص ۱۳۶

(۱۵) ایضاً، ''بے پھل فصلیں''، ص ۱۱۴

(۱۶) ایضاً، ''جلتے سورج کے نیچے''، ص ۱۳۲